پروفیسر خالد شبیر احمد　　قسط نمبر: ۴۸

ورق ورق زندگی

قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی عیادت:

ایک دن مجھے حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاری صاحب نے بلوایا، میں ملا تو کہنے لگے کہ قاضی صاحب بہت علیل ہیں لاہور میں ان کا علاج ہوتا رہا ہے طبیعت نہیں سنبھل سکی اور وہ واپس اپنے گھر شجاع آباد آ گئے ہیں ان کی عیادت کے لیے جانا ہے اور تم میرے ساتھ چلو چنانچہ ان کے ساتھ بذریعہ بس ہم دونوں شجاع آباد کے لیے روانہ ہوئے تو راستے میں کہنے لگے کہ رات انھیں خواب میں دیکھا تو ان کا قد دراز تھا اور خواب کی تعبیر کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ اچھا نہیں ہوتا۔ مجھے تو اب یہ یقین ہو چکا ہے کہ قاضی صاحب بھی ہم سب کو داغ مفارقت دینے والے ہیں۔ یہ گوہر نایاب بھی ہمیں چھوڑ کر جانے والے ہیں۔ بہر حال ہم بوجھل دل کے ساتھ شجاع آباد پہنچے تو ان کے گھر میں ان سے ملاقات ہوئی۔ وہ اپنے کمرے میں ایک بستر پر لیٹے ہوئے تھے۔ ہمیں دیکھ کر اٹھنے کی کوشش تو کی لیکن اٹھ نہ سکے۔ بستر پر لیٹے لیٹے ہم سے باتیں تو کرتے رہے لیکن صورت حال یہ تھی کہ کبھی ان کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑتے تو کبھی ہماری آنکھوں سے۔ تقریباً آدھ پون گھنٹہ وہ ہمارے ساتھ گفتگو کرتے رہے لیکن اٹھ کر بیٹھ نہ سکے۔ یہ دیکھ کر دل پہ کیا گذری وہ میں ہی جانتا ہوں۔ ان کی تقریریں یاد آ گئیں جب ان کا نورانی چہرہ تقریر کے دوران اور بھی روشن ہو جاتا تھا۔ وہ تقریر کے دوران اشعار اسی طرح پڑھتے جس طرح امیر شریعت پڑھتے تھے۔ معلوم ہوتا کہ کسی شاعر نے اسی موقع کے لیے شعر کہا ہو۔ ان سے زندگی بھر کی ملاقاتیں ایک ایک کر کے تصور میں ابھر کر آ گئیں۔ دوران گفتگو یہ سب کچھ ہوتا رہا پھر ہم دونوں واپس آ گئے۔

قاضی صاحب سے بچپن سے ہی ملنے کے مواقع ملے، پہلی دفعہ تو چنیوٹ میں ہی ملاقات ہوئی۔ ان کی تقریر تھی ابا جی مجھے ساتھ لے گئے اور ان سے ملوایا کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ مجھے اٹھا لیا۔ پیار کیا نام پوچھا میں نے کہا شبیر احمد کہنے لگے نماز آتی ہے میں نے کہا آتی ہے، اچھا تو پھر سناؤ، میں نے نماز سنائی تو کہنے لگے دعائے قنوت؟ میں نے کہا وہ نہیں آتی تو کہنے لگے وہ بھی یاد کرو۔ اس کے بغیر نماز کیسے پڑھو گے۔ ان کی نصیحت مجھے آج بھی یاد ہے۔

''بیٹے نماز پڑھنا، نماز نہیں پڑھو گے تو پیشاب والا ڈول بن جاؤ گے اور اگر نماز پڑھو گے تو دودھ والا جمونا (مٹی کا وہ خاص گھڑے کی طرح کا برتن جس میں دودھ جمایا جاتا ہے اور پھر اسے بلو کر لسی بنتی ہے اور مکھن نکالا جاتا ہے۔''

اس کے بعد دوسری ملاقات ۱۹۵۰ء میں ہوئی جب میں آٹھویں جماعت کا طالب علم تھا، لاہور جانا ہوا تو دفتر احرار میں گیا۔ وہاں کچھ رضا کار تھے ان سے پتہ چلا کہ امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ اور قاضی صاحب دونوں لاہور میں ہی ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ کہاں ہیں؟ کہنے لگے حاجی دین محمد صاحب کے کارخانے میں بادامی باغ، راستہ پوچھا اور تانگے میں سوار ہو کر میں سیدھا حاجی دین محمد صاحب کے کارخانے پہنچ گیا۔ وہاں پوچھا تو بتایا کہ اس بڑے کمرے میں دونوں حضرات تشریف فرما ہیں۔

میں نے ایک وسیع کمرہ میں اونچی جگہ دونوں حضرات کو دیکھا اکیلے بیٹھے ہوئے ایک دوسرے میں گم نظر آئے دو دلکش اور خوبصورت چہرے جیسے گلاب کے دو پھول، وہ جب بھی میرے تصور میں آتے ہیں تو دل و دماغ باغ باغ ہو جاتے ہیں۔ میں نے اندر داخل ہو کر السلام علیکم کہا۔ تو دونوں میری طرف متوجہ ہوئے، قاضی صاحب نے مجھے دیکھ کر تعجب سے کہا:

''اوئے شبیر تو ایتھے کیویں آ گیا ایں۔ میں نے کہا کہ آپ کو ملنے کے لیے آیا ہوں۔ میری طرف اشارہ کرتے ہوئے امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ سے کہا آپ اسے جانتے ہیں نذیر مجیدی صاحب کا بیٹا شبیر ہے۔ شاہ جی نے بھی مجھے پیار کیا۔ اس کے بعد قاضی صاحب نے امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ سے کہا کہ میں مولانا اختر علی خان سے مل آؤں؟ آپ نے جواب میں کہا کہ ہاں جاؤ۔ چنانچہ قاضی صاحب نے مجھے اپنے ساتھ تانگے میں بٹھا لیا اور دفتر لے آئے۔ وہاں سے ایک صندوق اٹھایا اور مجھے مولانا اختر علی خان (مولانا ظفر علی خان کے بیٹے جو اس وقت روزنامہ ''زمیندار'' کے ایڈیٹر تھے) کے دفتر لے گئے۔ مولانا اختر علی خان اٹھ کے ملے اور میں قاضی صاحب کے ساتھ دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ اب قاضی صاحب نے صندوق کھولا تو اس میں کتابیں ہی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ ایک کتاب نکالتے اور ایک خاص مضمون پر انھوں نے نشانی کے طور پر ایک کاغذ رکھا ہوا تھا۔ وہ مولانا اختر علی خان کو پڑھا دیتے اور ساتھ ہی کتاب کا نام اور صفحہ نمبر بھی بتاتے گئے۔ یہ سب کتابیں مرزا غلام قادیانی کی تھیں۔ اور انھیں دکھانے کا مقصد قادیانیت کے اصل چہرے سے متعارف کرانا تھا۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ قاضی صاحب کا معمول تھا کہ وہ یہ صندوق لے جاتے اور بڑے بڑے لوگوں سے ملاقات کر کے انھیں مرزا غلام قادیانی اور مرزا البشیر الدین محمود کی کتابیں پڑھاتے اور حوالے نوٹ کرواتے تھے۔

ایک دفعہ یہ بھی ہوا کہ چنیوٹ ختم نبوت کانفرنس میں قاضی صاحب نے تقریر کے دوران میز پر رکھی ہوئی کتابوں میں سے ایک کتاب کھولی اور کہا کہ ''مرزا غلام قادیانی کہتا ہے کہ میں نے اتنی کتابیں لکھی ہیں کئی الماریاں اس سے بھر جائیں۔ اب ذرا، اس کتاب کو میں پڑھ کر سناتا ہوں کہ دو سو صفحے کی اس کتاب میں مرزا غلام قادیانی نے کیا لکھا ہے۔''

قاضی صاحب نے کتاب سے پڑھ کر سنایا کہ اس میں لکھا ہے: ''جو مجھے نبی نہیں مانتا اس پر لعنت'' اور آگے ایک ہزار دفعہ لعنت لعنت ہی لکھا ہوا ہے۔

لوگ اس پر ہنستے بھی رہے اور نعرے بھی لگاتے رہے کہ مرزا قادیانی پر لعنت بے شمار، قاضی صاحب سے میری کئی ملاقاتیں ہیں جو میری زندگی کی اس کہانی میں آپ کو پڑھنے کے لیے مل جائیں گی۔ ۲۳ر نومبر ۱۹۶۶ء کو ملتان میں ہی تھا کہ یہ خبر بھی آخر مل گئی کہ قاضی احسان احمد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ غالباً حضرت مولانا سید عطاء المحسن بخاری کے ساتھ ہی میں شجاع آباد گیا۔ اور قاضی صاحب کے جنازے میں شرکت کی۔ دیر تک ان کی قبر پر کھڑا رہا۔ تصور میں جماعت احرار کے ہر بڑے رہنما کے جنازے میں شرکت کے دل خراش مناظر ایک ایک کر کے گھومتے رہے اور مجھے ان کی یاد دلاتے رہے، رلاتے رہے۔ آنکھوں سے آنسو تھمتے ہی نہیں تھے اور نہ ہی دل بہلتا تھا۔ یہ کیا لوگ تھے جو ایک ایک کر کے ہم سے رخصت ہو گئے مگر دل و دماغ پر اس طرح نقش ہو گئے کہ اب ان کے مٹنے کا کوئی امکان نہیں۔ یہ سب ایک ہی مٹی سے بنے تھے۔

حمیت وغیرت اور جرأت و بہادری کا نمونہ، دین سے محبت کرنے والے حریت کے پیغام بر، حسنِ اخلاق کی مثالِ مجسم، محبت کرنے والے، پیار سے دلوں کو فتح کرنے والے، فقر استغنا کے پیکر، دل جن کے نورِ ایمانی سے روشن تو دماغ منور تھے۔ایک سے ایک بڑھ کر جنون و عشق سے معمور، راہِ حق پر گامزن، جذبۂ ایمانی سے کفر والحاد کے طوفانوں کا رخ پھیر دینے والے۔ان کے بغیر تو اب ایسے لگتا ہے:

نہ ندی نہ ساحل کنارا، کشتی اور دریا ہے　　کوئی رستہ کوئی منزل کوئی نہ رہبر اپنا ہے
بحر کی موجوں سے جو کھیلے پہنچے وہی ہیں ساحل پر　　ہم بیٹھے یہ سوچ رہے ہیں پانی کتنا گہرا ہے
گھرے ہوگئے موت کے سائے رات نے ڈیرہ ڈال دیا　　بجلی کڑکی بادل گرجا ہر دل سہا سہا ہے

راستے میں واپسی پر بھی جدا ہونے والے اکابر احرار دل و دماغ پر چھائے رہے اور بار بار اپنی یادوں سے مجھے بے قرار کرتے رہے۔شاعر فطرتاً شدتِ احساس کا پرتو ہوتا ہے جو بات نثر میں ادا نہ ہو سکے وہ جب شعروں میں ڈھلتی ہے تو عجیب سماں پیدا کر دیتی ہے۔قاضی احسان احمد شجاع آبادی کی رحلت پر میرے اندر کے شاعر کو بھی جیسے بہت دکھ ہوا اور یہ اشعار لبوں تک آ گئے:

کیوں سو گیا وہ موت کی چادر کو تان کر　　''ڈھونڈا تھا آسماں نے جسے خاک چھان کر''
لاکھوں میں منفرد فقط وہ ایک فرد تھا　　''حق مغفرت کرے عجب آزاد مرد تھا''
بیتے زمانے سارے ہی چین و قرار کے　　''تم کیا گئے کہ روٹھ گئے دن بہار کے''

ذکر تو محسن احرار سید عطاء المحسن بخاری صاحب کا ہو رہا ہے درمیان میں ان کے ساتھ سفر شجاع آباد اور قاضی احسان احمد شجاع آبادی رحمتہ اللہ علیہ کے جنازے میں ان کے ساتھ شرکت کا ذکر بھی آ گیا۔۱۹۶۹ء میں میرا تبادلہ بہاولپور ہو گیا اور ۱۹۷۳ء میں فیصل آباد گورنمنٹ کالج میں تبدیلی ہو گئی لیکن بہاولپور ہو کہ فیصل آباد، شاہ صاحب سے ملاقاتوں کا سلسلہ جاری رہا۔۱۹۹۷ء میں چنیوٹ میں اپنا مکان بنالیا، پھر چنیوٹ میں اپنے شہر واپس آ گیا اور آج تک وہیں رہائش پذیر ہوں۔۱۹۹۷ء میں سید عطاء المحسن شاہ صاحب کو دار بنی ہاشم میں مجلس شوریٰ کے اجلاس میں مجلس احرار اسلام کی صدارت کے لیے چن لیا گیا۔اور ان کے ساتھ محمد مولانا اسحاق سلیمی صاحب کو جنرل سیکریٹری کے لیے منتخب کیا گیا۔

چنیوٹ سے ہی میں نے ۱۹۹۹ء میں لاہور کے مرکزی دفتر کی افتتاحی تقریب میں شرکت کی تھی۔اس وقت سید عطاء المحسن شاہ صاحب شدید علیل تھے اور لاہور میں ہی ان کا علاج ہوتا رہا۔جب افاقہ نہ ہوا تو پھر انھیں ملتان کے نشتر ہسپتال میں داخل کر دیا گیا۔جہاں ان کا علاج جاری رہا مگر شفایاب نہ ہو سکے۔آخری وقت تک ذکر الٰہی ان کے لبوں پر تھا۔ساری عمر کفر والحاد کی قوتوں سے برسرِ پیکار رہنے والا یہ بطلِ حریت تقریباً ایک سال کی طویل علالت کے بعد ہم سب کو چھوڑ کر وہیں چلے گئے جہاں سب کو جانا ہے۔

۱۲/ اکتوبر ۱۹۹۹ء مولانا سید عطاء المحسن بخاری کی رحلت اور جنازے میں شرکت:

میں لاہور میں جماعت کی کسی تقریب میں شامل ہو کر واپسی پر چنیوٹ گھر کے قریب تانگے پر ہی سوار تھا کہ شہزادہ محمد اکبر (نمائندہ نوائے وقت) نے مجھے ان کی رحلت کی خبر سنائی۔ یہ خبر بجلی کے کرنٹ کی طرح میرے دل و دماغ کو چھو گئی لیکن جلد ہی سنبھل گیا کہ اب تو ایسی خبریں سننے کا میں عادی ہو چکا تھا۔ صدمہ تو شدید تھا مدتوں کی رفاقتیں کیا کیا قیامتیں بن کے آئیں اور چند لمحوں میں گزر گئیں۔ جنازے میں شرکت کے لیے ملک رب نواز اور شہزادہ اکبر سے ساتھ رابطہ کیا۔ رات ایک بجے چنیوٹ سے ملتان جانے والی نان سٹاپ بس کا فیصلہ ہوا۔ بس پر سوار ہوئے اور تین گھنٹوں کی مسافت کے بعد ہم تینوں چوک کمہاراں میں اترے۔ ابھی اتنی رات باقی تھی کہ دار بنی ہاشم کی بجائے ہم نے ایک ہوٹل میں بیٹھ کر سید عطاء المحسن شاہ صاحب کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت اور ان کے ساتھ ہونے والی ملاقاتوں کے تذکرے میں دو تین گھنٹے صرف کیے اور پھر دار بنی ہاشم کی طرف روانہ ہو گئے۔ لیکن ہم نے دارِ بنی ہاشم کے پڑوسی پروفیسر محمود قریشی کے گھر جانا مناسب سمجھا۔ انھوں نے ساری کیفیت بیان کی اور اس کے بعد ہم نے جنازے میں شرکت کی۔ سپورٹس گراؤنڈ میں جنازہ ہوا جہاں پر حضرت امیر شریعت، مولانا سید ابوذر بخاری اور ان کے خاندان کے دوسرے افراد کے جنازے پڑھے گئے۔ پھر خاندانِ امیر شریعت کے احاطہ قبرستان پہنچے، جب لوگ ان کی تدفین میں مصروف تھے مجھے اس وقت وہ سماں بھی یاد آ گیا جب مولانا ابوذر بخاری رحمتہ اللہ علیہ کی تدفین کے وقت امیر شریعت رحمتہ اللہ علیہ کے مزار کے ساتھ محسن شاہ صاحب شدت غم سے نڈھال ہو کر زمین پر بیٹھے آنسو بہا رہے تھے۔ آج اسی طرح ہم زمین پر بیٹھے ان کی وفات پر اپنے گہرے رنج و غم کا اظہار کر رہے تھے اور ان کی زندگی میں ان کے مختلف واقعات کو دل و دماغ کی گہرائیوں میں سمیٹے ہوئے اپنے آنسوؤں سے انھیں خراج تحسین پیش کر رہے تھے۔ ایک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی کے مصداق اس تاریکی کو سامنے دیکھ رہے تھے۔ ان کے بچھوڑے سے لے کر اب تک وہ تاریکی دل و دماغ پر مسلط ہی ہے اور شاید رہے کہ اب ان کے بعد کوئی بھی تو ایسا نظر نہیں آتا جو ان سے بچھڑنے کے اس خلا کو پر کرے۔ ہم دیر تک ان کی قبر پر بیٹھے رہے اور سوچتے رہے:

کتنے تھے دل خراش مناظر حیات کے — دیکھے گئے نہ ہم سے مگر دیکھتے رہے
شیشے پہ دل کے عکس نما تھا جمال یار — ہم وارداتِ قلب ونظر دیکھتے رہے

اور یہ کہتے ہوئے گھر کو لوٹ آئے:

تربت سے تیری دم بدم آتی ہے یہ صدا — ''ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما''
رحلت پہ تیری غم میں ڈوبا دل میرا کہے — ''مقدور ہو تو ساتھ رکھوں نوحہ گر کو میں''
سو گئیں جو موت کی چادر کو اوڑھے اب تلک — ''خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں''

ان کی وفات پر ایک نظم کہی تھی اس کے چند اشعار نذر قارئین ہیں:

تیرے قلم کی آبرو تھی شدتِ جنوں — ہر حرف تیرا شوکت اسلام کا تھا باب

تیرا قدم قدم بنا اک عہد آفریں — لاؤں کہاں سے ڈھونڈھ کے تیرا کوئی جواب
تو گلشن احرار کی بہارِ جاوداں — روشن تیرے وجود سے جہانِ انقلاب
نقشِ جمیل تیرا میری جاں پہ عکس ریز — جیسے کہ جوئے آب پر ہو چاند محوِ خواب
تقریر تیری آبشارِ جذب و کیف تھی — تحریر تیری شوکتِ جنوں کی اک کتاب
لاریب تیرے دم سے ہے روشن ضمیرِ شوق — پیتے ہیں تیری یاد کی ہر دم شرابِ ناب
بنتا ہے جس کے فیض سے ہر مرد، مردِ حُر — خالد کو ہے نگاہِ بخاری سے انتساب

عمرہ کی سعادت نومبر ۱۹۱۹ء:

نومبر کا مہینہ تھا اور اسی مہینے میں رمضان المبارک بھی، تاریخ تو یاد نہیں ہم چار افراد ڈاکٹر ریاض مجید کی قیادت میں لاہور ایئر پورٹ سے سعودی عرب کے جہاز کے ذریعے لاہور سے ہی احرام باندھے عمرہ کے لیے روانہ ہوئے۔ تقریباً چار پانچ گھنٹوں کے سفر کے بعد ہم جدہ ایئر پورٹ پر تھے۔ وہیں سحری کی اور جدہ ایئر پورٹ پر ہی نماز فجر ادا کی۔ جدہ سے پھر ہم مکہ مکرمہ کے لیے روانہ ہوئے تو صبح سویرے ہی ہم مکہ معظّمہ پہنچ گئے۔ ٹیکسی حرم شریف کے سامنے رکی تو لوگوں نے گھیر لیا کہ آیئے آپ کو رہائش دیکھائیں۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک آدمی جو پنجابی تھا اس کے ساتھ روانہ کیا کہ جاؤ اس کے ساتھ جا کر رہائش دیکھ آؤ ہم یہیں کھڑے ہیں۔ خالد بن ولید روڈ سے اوپر ایک پہاڑی پر وہ مجھے لے گیا اور ایک کمرہ دکھایا جس میں چار آدمی بڑے آرام سے رہ سکتے تھے۔ ایک فریج بھی تھی۔ ساتھ ہی غسل خانہ بھی، اس کے علاوہ سب سے اہم بات یہ تھی کہ چند قدموں کے فاصلے پر حرم شریف تھا۔ انتہائی نزدیک، مجھے اس وجہ سے بھی یہ جگہ پسند آ گئی کہ یہاں سے حرم شریف جانا انتہائی آسان ہوگا۔ چنانچہ میں نے واپس آ کر ساری بات ڈاکٹر صاحب کو بتا دی اور ہم چاروں، ایک میں، ڈاکٹر صاحب، میرے ایک عزیز دوست چودھری امین ایڈووکیٹ کے بیٹے اور ڈاکٹر ریاض مجید کے داماد مصدق اور چوتھے ہمارے ہی کالج کے ایک پروفیسر جن کا نام ذہن میں نہیں آ رہا کمرے میں آئے تو ڈاکٹر صاحب نے ایک لیکچر دیا کہ عمرہ کے لیے کیا کیا ضروری ہے اور ہم نے اسے اس طرح سے یاد کر لیا جیسے کوئی سبق یاد کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب پہلے ہی کئی مرتبہ عمرہ کی سعادت حاصل کر چکے تھے۔ احرام ہم نے باندھا ہوا تھا۔ لیکن نیچے اترے تو مزاج، طبیعت، احساس، توجہ سب کچھ تبدیل ہو چکا تھا۔ پس یوں سمجھئے کہ توجہ الی اللہ اپنے عروج پر تھی اور دل و دماغ میں ”میں“ نام کی کوئی شے کہیں دور دور تک ہمیں نظر نہیں آ رہی تھی۔ فضا ایسی تھی کہ جس میں دم لینے کے لیے ساری عمر ترستے رہے۔ قدم قدم پر اللہ کی عظمت رہنمائی کر رہی تھی۔ دل میں ایک ہول سا بھی تھا کہ خانہ کعبہ کی زیارت کا حوصلہ کیسے کریں گے۔ کیسے اس مرکز اسلام کو دیکھ سکیں گے۔ جس کی تعمیر کے لیے کئی پیغمبروں نے مزدوری کی اور اس کی آبادی اور رزق کی فراوانی کی دعائیں مانگی وہاں پہنچے تو خانہ کعبہ جس کی تصویریں عمر بھر دیکھتے رہے ہمارے سامنے تھا۔ کچھ دیر تک تو میں مبہوت رہا۔ بس نظریں خانہ کعبہ پر جمی رہیں۔ جی چاہتا تھا کہ بس یونہی اس کے سامنے کھڑا کھڑا زندگی گزاروں کہ ڈاکٹر صاحب نے طواف کے لیے کہا، طواف مکمل ہوا تو پھر سعی کی گئی اور پھر سر کے

بال اترے اور واپس اپنی جگہ پر آ گئے، کچھ دیر کمرے میں آرام کیا سفر کی تھکاوٹ دور ہوگئی تو دوبارہ دوسرے کپڑے پہن کر نماز ظہر سے پہلے حرم شریف میں آ کر بیٹھ گئے۔ جب تک مکہ معظّمہ میں رہے یہی معمول بن گیا کہ صبح نماز تہجد کے لیے اس جگہ جو کہ ڈاکٹر صاحب نے مقرر کر دی تھی پہنچ جاتے اور پھر نماز فجر ادا کرتے۔ میں تو تھوڑی دیر تک کمرے میں آرام کرتا اور پھر سارا دن وہیں کبھی تلاوت کبھی درود شریف اور پھر کبھی طواف، افطاری بھی حرم شریف میں اور تراویح تک وہیں قیام رہتا۔ رات گیارہ بجے واپسی کسی ہوٹل پر کھانا اور پھر اسی کمرے میں آ کر ذرا آرام کرتے اور جتنے دن مکہ معظّمہ میں رہے یہی معمول رہا۔ ایک دن ڈاکٹر صاحب کہنے لگے اگر طبیعت حاضر ہو تو کچھ لکھ بھی لیا کرو میں دیکھ لوں گا۔ ایک رات جب ہوٹل سے واپس کمرے میں آئے تو طبیعت حاضر تھی چند شعر لکھ لیے:

درد دل کو اک سہارا مل گیا کشتیِ دل کو کنارہ مل گیا
دیکھ کر طیبہ ہوئی آسودگی ہم کو گویا گھر ہمارا مل گیا
میرے دل کی شادمانی کا نہ پوچھ مجھ کو اک ایسا نظارہ مل گیا
شہر مکہ میں جو آ پہنچا ہوں میں اپنی بخشش کا اشارہ مل گیا
آ گیا خالد حضوری کا بھی رنگ نعت کا اسلوب سارا مل گیا

قیام مکہ کے دوران یہی معمول رہا کوہ ہند کے اس مکان میں رہائش خالد بن ولید روڈ سے بابِ عمرہ اور حرم شریف میں داخلہ اور رات کو ہوٹل سے کھانا کھانے کے بعد وہیں رہائش۔

مدینہ منورہ:

پھر مدینہ منورہ حاضری کے لیے رات کو بس کے ذریعے روانہ ہوئے تمام رات سفر میں گزری۔ راستے میں ایک جگہ سحری کی اور صبح سویرے مدینہ منورہ پہنچ گئے۔ یہاں پر بھی جو کیفیت تھی وہ بیان سے باہر ہے۔ زبان گنگ، ادب و احترام کی چادر سر پر، قدم قدم پر آپ کی عظمت، آپ کی رحمت کا سایہ محسوس ہوتا تھا اور بات کرتے ہوئے بھی خوف آتا تھا۔ شوقِ عقیدت دل و دماغ پر پوری طرح مسلط، دل و نگاہ میں آپ کی سیرت کے مختلف باب سمٹ کر آ گئے۔ یوں محسوس ہو رہا تھا کہ آسمانوں سے کوئی خاص قسم کی روشنی اتر رہی ہے۔ دل کے آنگن میں دل کی خوشبو سے روح معطر ہوتی جاتی ہے۔ پاؤں زمین پر تھے مگر نصیب اوج پر نظر آتا محسوس ہوتا۔ اسی کیفیت میں مبتلا ہم روضہ اقدس کے سامنے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے کہا یہیں قیام ہوگا۔ یہ ''ستون نعت'' ہے جتنے دن یہاں گزارنے ہیں یہی پر بیٹھنا ہے ہمارے سامنے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کی مسجد اور محراب تھا۔ یہاں سے چند قدموں کے فاصلے پر ریاض الجنہ کا حصہ شروع ہو جاتا ہے۔ ہمارے اور مسجد نبوی کے درمیان وہ چھتریاں تھیں جو بوقت ضرورت کھل بھی جاتیں اور بند بھی ہو جاتی تھیں۔ سب سے اچھی بات یہ تھی کہ روضۂ اقدس ہر وقت ہمارے سامنے رہتا۔ آٹھ دن یہاں پر قیام رہا یہیں افطاری، تراویح اور پھر رات کو کچھ فاصلے پر ایک ہوٹل میں قیام۔

ڈاکٹر صاحب نے جہاں ہمیں بٹھایا اسے ستون نعت کہا اس لیے کہ وہ کہتے کہ حفیظ تائب اور حافظ لدھیانوی صاحب کے ساتھ جب بھی ہم مسجد نبوی آئے تو اسی ستون کے ساتھ ہمارا قیام رہا، اس لیے ہم نے اس کا نام ستون نعت رکھ دیا ہے۔ تراویح کی نماز ادا کرنے کے بعد روزانہ ہماری ملاقات ملتان کے ایک احرار رضا کار قاری عبداللطیف سے ہوتی۔ وہ ہمیں دعوت دیتے ڈاکٹر صاحب نے دعوتوں پر پابندی لگا دی تھی کہ دعوتوں پر وقت ضائع ہوتا ہے بس مسجد نبوی میں ہی رہنا ہے لیکن میں نے گزارش کی کہ اپنے احرار کا رکن ہیں اور ان کی دعوت تو قبول کرنی چاہیے۔ چنانچہ ایک دن قاری صاحب جو نماز کے بعد مختلف ملکوں کے حفاظ کو فن تجوید سے قرآن پڑھانے پر مامور تھے ان کے گھر گئے اور پر تکلف دعوت کھائی۔ وہ حضرت پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری اور دوسرے احرار رضا کاروں کے بارے میں کوئی نہ کوئی بات پوچھتے اور احرار کے رضا کار ہونے پر فخر کرتے ہوئے ملتان کے مختلف واقعات ہمیں سناتے۔ آٹھ دن کے قیام کے بعد مدینہ منورہ کی زیارتیں کی اور پھر وہیں سے احرام باندھ کر واپس مکہ معظّمہ آ گئے۔ عید مکہ میں ادا کی یہاں پر ایک دن ملک محمد یوسف صاحب سے (لاہور سے جماعت کے اہم رکن) اتفاقاً ملاقات ہوئی وہ طواف کے بعد مقامِ ابراہیم پر نفل ادا کررہے تھے تو میری نگاہ ان پر پڑ گئی۔ ہم دونوں ایک دوسرے سے مل کر بہت خوش ہوئے پھر روزانہ ان سے ملاقاتیں رہیں، ان کی وجہ سے کچھ دن اور بڑی اچھی طرح سے گزر گئے۔ گھر سے کوئی نہ کوئی چیز ہمارے کھانے کے لیے لے آتے ہمیں کھلاتے اور خوش ہوتے۔ پھر واپسی پر مکہ معظّمہ کی زیارتیں، میدان عرفات، غار ثور، غار حرا اور اس طرح کی کئی دوسری اہم جگہوں کی زیارت کر کے تقریباً ڈیڑھ ماہ کے بعد واپس آ گئے۔

آرزوؤں کو بارور دیکھا　　شوق ہوتا ہوا امر دیکھا
جس کے چرچے ہیں آسمانوں میں　　اے خوشا! ہم نے بھی وہ گھر دیکھا
صحن نبوی میں بندگی دیکھی　　دل پہ ہوتا عجب اثر دیکھا
باب رحمت پہ یوں جھکی نظریں　　پھر نہ ہم نے ادھر ادھر دیکھا
شکرِ ایزد کہ شہر مرسل کو　　ہم نے خالد بہ چشم تر دیکھا

ڈاکٹر ریاض مجید صاحب نے مجھے کہا تھا کہ کچھ نعتیں مکہ و مدینہ میں کہہ لینا۔ وہاں پر لکھی گئی نعتوں کے چند اشعار پیش خدمت ہیں کہ یہ حضوری کی نعتیں اپنے اسلوب میں دوسری نعتوں سے مختلف ہوتی ہیں۔

آسمانوں سے اترتی روشنی اچھی لگی　　وجد میں ڈوبی ہوئی وہ چاندانی اچھی لگی
ہاں عقیدت کی فضا میں سسکیاں بھرتی ہوئی　　صحن نبوی میں نمازِ بندگی اچھی لگی
تھے زمیں پہ پاؤں میرے آسمانوں پر نصیب　　روح میں اتری ہوئی اک بے خودی اچھی لگی
روضۂ اقدس پہ نظریں جم کے میری رہ گئیں　　گنبد خضریٰ کی مجھ کو سادگی اچھی لگی
جب کھڑا تھا ہاتھ باندھے میں مواجہ پر وہاں　　مجھ کو خالد التجا و عاجزی اچھی لگی

روتا تھا میرا بخت بھی قلب و جگر کے ساتھ　　رخصت ہوا مدینے سے جو چشم تر کے ساتھ
پھیلی ہوئی تھی چاندنی ان کی ہی چار سو　　رقصاں تھی میری جان بھی قلب و نظر کے ساتھ
چشمے سرور و کیف کے دل سے ابل پڑے　　جب درپہ تھا میں ان کے دل مفتخر کے ساتھ
وقت نماز رونا وہ سب کا مجھے ہے یاد　　جب دل بھی رو رہا تھا مری چشم تر کے ساتھ
میں تو وہاں سے آگیا یادیں لیے ہوئے　　دل رہ گیا وہیں کہیں دیوار و در کے ساتھ
خالد بوقت نعت یہ میری تھی کیفیت　　دل بیٹھ بیٹھ جاتا تھا عجز ہنر کے ساتھ

مجلس احرارِ اسلام کی جنرل سیکریٹری شپ:

۲۰۰۲ء میں دار بنی ہاشم میں مجلس شوریٰ میں مجھے دوبارہ جماعت کا سیکریٹری جنرل بنایا گیا اس سے پہلے ۱۹۹۵ء میں بھی دو سال کے لیے میں جنرل سیکریٹری رہ چکا تھا۔ جب دوبارہ سیکریٹری بنایا گیا تو اس وقت مولانا محمد اسحاق سلیمی صاحب سیکریٹری جنرل تھے اور پیر جی سید عطاء المہیمن مدظلہ ان کے ساتھ جماعت کے امیر تھے جو محسن احرار سید عطاء المحسن شاہ صاحب کی وفات کے بعد امیر بنائے گئے تھے۔ پھر جب مئی ۲۰۰۸ء میں دوبارہ مجلس شوریٰ کا اجلاس لاہور میں ہوا تو اس اجلاس میں، میں نے کہا کہ اب کسی اور کو جماعت کا ناظم اعلیٰ بنایا جائے۔ میں نے عبداللطیف خالد چیمہ صاحب کا نام اس کے لیے شوریٰ میں پیش کیا جو اس وقت جماعت کے ناظم نشر واشاعت تھے لیکن انھوں نے انکار کر دیا اور بڑی مشکل سے انھیں ناظم اعلیٰ کا عہدہ تسلیم کرنے پر آمادہ کیا گیا۔ اس وقت سے آج تک وہی جماعت کے ناظم اعلیٰ ہیں۔ جبکہ جماعت کے امیر پیر جی سید عطاء المہیمن بخاری مدظلہ ہی ہیں۔ اس طرح میری سیکریٹری شپ کی مجموعی مدت آٹھ سال بنتی ہے۔

چنیوٹ میں محفل آرائی:

چنیوٹ میں آیا تو یہاں پہلے پہلے تو میں نے اپنے آپ کو ایک اجنبی سا محسوس کیا کہ ۱۹۴۸ء سے میں یہاں سے چلا گیا تھا اور پھر ۱۹۹۷ء میں واپس آیا۔ یہ ایک لمبا عرصہ تھا اس دوران اگر چنیوٹ میں آیا بھی تو والدین کو ملنے کے لیے ایک دو دن رہا اور پھر واپس چلا گیا۔ لیکن آہستہ آہستہ یہاں پر میں نے اپنا حلقۂ دوستانہ بنالیا تھا۔ شام کو مسجد کے قریب نمازِ مغرب کے بعد ہم یہاں ایک ہوٹل کے پاس اکٹھے ہوتے اور مختلف موضوعات پر گفتگو ہوتی اس طرح محفل آرائی کا ذوق وشوق بھی جواں رہا۔ یہاں پروفیسر سلیم اختر، پروفیسر ایوب صاحب جو اب اسلامیہ کالج کے پرنسپل ہیں، پروفیسر شمشاد خان، ملک منیر صاحب مرحوم جو اسلامیہ کالج کے پرفیسر تھے اور پروفیسر غوث اختر صاحب کے علاوہ پرفیسر ممتاز شہباز صاحب مرحوم، ابرار خواجہ، عادل یزدانی، قیصر عباس، عارف خواجہ اور چند دوسرے شعراء بھی شامل تھے۔ اور اس طرح بحث مباحثہ کے دوران قدرے تلخی کی صورت بھی پیدا ہوتی بعد میں دوبارہ ایسے ہو جاتے کہ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں تھا۔ کئی برسوں تک یہ سلسلہ چلتا رہا اور جماعت کے ساتھ وابستگی بھی قائم رہی۔ جس کا ذکر آئندہ قسط میں تفصیل کے ساتھ ہوگا۔

(جاری ہے)